

رسائل و مسائل

نظام تعلیم کے متعلق چند بنیادی سوالات

سوال: بندہ درس و تدریس کے کام سے ایک عرصہ سے وابستہ ہے اور آج کل یہاں تعلیم ہے یہاں ماہرین تعلیم سے اکثر تعلیمی موضوعات پر بحث رہتی ہے۔ چنانچہ شکاگو یونیورسٹی کی فرمائش پر بندہ ایک مقالہ قلم بند کرنے کی کوشش کر رہا ہے، جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ پاکستان کی تعلیمی ضروریات امریکہ اور دیگر ممالک کی ضروریات سے بہت مختلف ہیں پاکستانی ضروریات کا حل اسلام کے بنیادی اصول کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ اگر امریکن طرز تعلیم بغیر سوچے اختیار کیا گیا تو ناقابل تلافی نقصان ہونے کا خطرہ ہے۔

جناب کی بیشتر تصنیفات میری نظر سے گزر چکی ہیں اور اب رہنمائی کر رہی ہیں۔ ایک دو سوال کچھ اس پیچیدہ نوعیت کے درپیش ہوئے کہ میں نے ضروری سمجھا کہ جناب سے براہ راست رہنمائی حاصل کی جائے۔ امید ہے کہ آپ اپنی تمام مسروریات کے باوجود کچھ وقت نکال سکیں گے۔ اپنی گزارشات سلسلہ وار تحریر کرتا ہوں۔

ا۔ جن ملکوں میں صنعتی ترقی ہوئی وہاں لازمی طور پر عام اخلاقی تنزل ہوا۔ ملوں، کارخانوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے عورت، مرد، بچے تک مشینوں کے پرزے بن گئے۔ ان ملکوں کے نتیجے کے طور پر کچھ مفکر پیدا ہوئے (مثلاً امریکہ میں جان ڈیوی)، جنہوں نے نئی طرز کی زندگی کو نظریاتی سہارا دیا۔ روایات کو غلط قرار دیا۔ اور سوسائٹی کی اقدار ہی کو بدل دیا! پاکستان میں ایک طرف تو صنعتی ترقی ضروری ہے۔ دوسری طرف اسلامی روایات، اور اقدار کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ براہ کرم فرمائیے کہ یہ بظاہر

متضاد مقاصد کیسے حاصل ہو سکتے ہیں؟ مثبثنی فضا میں روح کیسے تازہ رہ سکتی ہے؟ تبدیلی لازمی ہیں۔ مگر کس حد تک متبادل قبول ہیں؟

۲۔ اسلامی تعلیم کس قسم کی ہو؟ کیا سبکے لیے ہو؟ فری ہو یا نہ ہو؟۔ وہ نمونے کی شخصیت جو سکول کو پیدا کرنی چاہیے اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ کیا ہمارے دینی مدارس ایسی شخصیتیں پیدا کر رہے ہیں؟

۳۔ نمونے کی اسلامی گھریلو زندگی کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ کیا موجودہ گھریلو زندگی اسلامی ہے؟ کیا مشہر اور گاؤں میں ایک طرز کی گھریلو زندگی ہوگی؟۔ موجودہ گھریلو زندگی میں پرانی ہندوستانی روایات کا کتنا دخل ہے؟

جواب: یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ آج کل امریکہ میں فن تعلیم کی تحصیل فرم کر رہے ہیں۔ جن موضوعات کا آپ نے اپنے عنایت نامے میں ذکر کیا ہے وہ فی الواقع بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے متعلق مختصراً اپنے خیالات عرض کیے دیتا ہوں۔

انسانی تمدن میں مادی تغیرات کی مثال ان تغیرات کی سی ہے جو فرد انسانی کے جسم میں بچپن سے جوانی، جوانی سے کہولت اور کہولت سے بڑھاپے کی طرف منتقل ہوتے وقت رونما ہوتے ہیں۔ ان کا روح اور نفس سے گہرا تعلق ضرور ہے، مگر ان تغیرات کے نتائج کا کوئی ایسا متعین اور قطعی ٹھپہ نہیں ہے جو تمام انسانوں کے نفس پر ہمیشہ کیسا نیت کے ساتھ لگتا ہو بلکہ ان میں فرد فرد کے لحاظ سے بھی، اور انسانی جماعتوں کے لحاظ سے بھی بڑا فرق ہوتا ہے جس میں بہت سے دوسرے عوامل کا رفرما ہوتے ہیں۔ اگر تعلیم، تربیت اور معاشرتی ڈھانچہ جو کسی فرد انسانی کو میسر آئے، ایسا صالح ہو کہ فرد کو ارتقاء حیات کی طرف لے جانے کے ساتھ ساتھ وہ ایک عمدہ اور مضبوط سیرت کو بھی اس کے اندر نشوونما دیتا ہے تو بچپن سے جوانی کی عمر میں داخل ہوتے وقت اس کی طبیعت کی جوانی غلط راہوں پر جانے کے بجائے بہترین تعمیری راہیں اختیار کرتی ہے اور یہی ارتقاء بڑھاپے تک صحیح طریقے سے بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن اگر تعلیم کسی صحیح فکر کو نشوونما دینے والے فلسفے پر مبنی نہ ہو، اور تربیت بھی غلط عادات و خصلتوں

پیدا کرنے والی ہو اور پھر معاشرتی ڈھانچہ بھی بگاڑنے والا ہی میسر آئے تو ایک بچہ آغاز ہوش ہی سے مجرم بننا شروع ہوتا ہے، جوان ہو کر چور اور ڈاکو بن کر اٹھتا ہے اور بڑھاپے تک اس کی جرائم شکنجہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح انسانی تمدن میں جو مادی تغیر مثلاً صنعتی انقلاب سے رونما ہوا، اس میں بجائے خود کوئی خرابی نہ تھی۔ اس میں انسان کی بھلائی ہی کا سامان تھا، جیسا کہ جوانی کا آنا بچاؤ خود کوئی برائی نہیں بلکہ انسان کے لیے اپنی ذات میں رحمت ہی ہے۔ لیکن قصور اس فلسفہ حیات کا تھا جو سوٹھویں تترھویں صدی سے یورپ میں نشوونما پا رہا تھا۔ اس نے ذہن کو بگاڑا، ذہن کے بگاڑ نے اخلاق خراب کیے، اور اخلاق کی خرابی نے معاشرتی ڈھانچے کو، جو دور جاگیرداری سے بگڑا ہوا چلا آ رہا تھا اور زیادہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اس حالت میں صنعتی انقلاب کی طاقت میسر آ جائے تو میں کی تو میں جرائم پیشہ بن گئیں اور اب ایٹم کی طاقت پا کر تہذیب کی ساری نمائندوں کے باوجود اسفل السافلین کی طرف جارہی ہیں۔ اس حالت میں جو فلاسفہ لوگوں کو اس بگاڑ پر مطمئن کرنے کے لیے نئے نئے نظریاتی سہارے دیتے ہیں اور بگڑے ہوئے سانچے سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے سوسائٹی کی اقدار بدلنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی مثال اس دشمن دوست نما کی سی ہے جو ایک بگڑتے ہوئے بچے کو پہلی مرتبہ جیب کاٹنے پر ثنا باش کہے اور اسے یقین دلائے کہ یہ جیب تراشی تو ایک بہترین آرٹ ہے جس کی مذمت کرنے والے لوگ محض دقتیافوسی ہیں۔

میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ مادی ترقی کے مقاصد اور اسلامی اقدار کے مقاصد میں کوئی حقیقی تضاد ہے۔ نہ میں یہ مانتا ہوں کہ یورپ میں صنعتی ترقی کے ساتھ جس مخصوص تمدن و تہذیب نے نشوونما پایا ہے یہ صنعتی ترقی سے کوئی جوہری تلامذہ رکھتا ہے اور لازماً جب اور جہاں بھی یہ ترقی ہوگی وہاں یہی تہذیب ظہور میں آئے گی یا آئی چاہیے۔ اسی طرح یہ مفروضہ بھی میرے لیے قابل قبول نہیں ہے کہ انسانی روح چوتھے اور چاک اور چکی کے ساتھ تو تازہ رہ سکتی تھی مگر مشین ہی کی فطرت کچھ ایسی ہے کہ اس سے سابقہ پیش آتے ہی اس روح پر مرنی چھا جائے۔ میرے نزدیک ایک صحیح فلسفہ حیات سے اگر ذہن درست کیے جائیں، ایک صالح نظام اخلاق اگر سیرت گری کے لیے استعمال

کیا جائے، اور ایک معتدل و متوازن معاشرتی ڈھانچہ انسانوں کو منبھانے کے لیے موجود ہو تو صنعتی ارتقاء اور سائنس سے حاصل ہونے والی قوتوں کا استعمال موجودہ مغربی تمدن و تہذیب کے بنیادی طور پر بالکل مختلف ایک دوسرے تمدن و تہذیب کو نشوونما دے سکتا ہے، جو اس سے بدرجہا زیادہ طاقت ور بھی ہو اور پھر انسانیت کے لیے باعث رحمت بھی مجھے یقین ہے کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہیں اس طرح کا فلسفہ حیات اور نظام اخلاق دے سکتا ہے اور اس کی رہنمائی عملاً قبول کر کے اگر ہم اس کی ہدایات کے مطابق اپنا نظام تعلیم و تربیت عائد، اور اپنا معاشرتی ڈھانچہ بنالیں تو ان شرائط کی تکمیل ہو سکتی ہے جو اوپر میں نے مادی ترقی کے ساتھ ایک صالح تہذیب کی تشکیل کے لیے بیان کی ہیں۔ اس معاملے میں یہودیت پہلے ہی مایوس کن تھی، عیسائیت نئے دور کے آغاز ہی میں ناکام ثابت ہو گئی، اور بودھ مت سرے سے اس میدان کا مرد تھا ہی نہیں۔ رہے جدید مذاہب، سوشلزم، فاشنزم اور کمیونزم، سو وہ اپنے تمام عیوب و محاسن کھول کر سامنے لا چکے ہیں آمد دنیا خوب دیکھ چکی ہے کہ ان کے محاسن کو ان کے عیوب سے کیا نسبت ہے۔ نیا کوئی فلسفہ بھی اب تک ایسا سامنے نہیں آیا ہے جو ایک تہذیب کی بنیاد بننے کی اہمیت رکھتا ہو۔ اس کو سوچنے والے تمام تر اہل مغرب ہیں اور وہ اپنی اس تہذیب کے زہر پلینے سے تنگ آنے کے باوجود اس کی بنیادوں میں تغیر کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے ذہن اس کے حدود سے آزاد ہو کر سوچنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ صرف جزوی ترمیمات سے کام چلانا چاہتے ہیں اور ان میں سے اکثر کی تجویز کردہ ترمیمیں مزید بگاڑ ہی کی طرف لے جانے والی ہیں اس مختصر خط میں میرے لیے وہ وجوہ بیان کرنا مشکل ہے جن کی بنا پر میں اس معاملہ میں اسلام کو علی وجہ البصیرت کافی ہی نہیں بلکہ انسانیت کے لیے ایک ہی شعار امید سمجھتا ہوں۔ ان دلائل کے اعادہ کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ میں انہیں اپنی متعدد کتابوں میں بیان کر چکا ہوں، مثلاً اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم وغیرہ اس کے علاوہ میرے بہت سے مضامین میں بھی اس کی طرف اشارات موجود ہیں۔

آپ کے دوسرے سوالات کا جواب یہ ہے کہ اسلامی تعلیم اس دور کے لیے جس طرز پر دی جانی چاہیے اسے میں نے اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب تعلیمات میں بیان کیا ہے۔ آپ اسے ملاحظہ فرمائیں۔ میرے نزدیک یہ تعلیم ہر بچے کو ملنی چاہیے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، البتہ اس کے مدارج میں صلاحیتوں کے لحاظ سے فرق کیا جانا چاہیے۔ اس کو ابتدائی حد تک جبری اور کم از کم ثانوی حد تک سب کے لیے بالکل مفت ہونا چاہیے، اور آگے کے مدارج میں خاص صلاحیت رکھنے والے نوجوانوں کی کفالت بھی ریاست کو کرنی چاہیے۔ جو نمونے کی شخصیت ایک مدرسے کو پیدا کرنی چاہیے اس کی خصوصیات صرف چار اسلامی اصطلاحوں میں بیان کی جاسکتی ہیں: ہومن ہو، مسلم ہو، متقی ہو اور محسن ہو۔ ان اصطلاحوں کو آپ جتنے زیادہ وسیع معنوں میں لیں گے شخص مطلوب اتنا ہی زیادہ جامع کمالات ہوگا۔ تنگ معنوں میں لیں تو صنعتی ترقی کی باتیں اور اس ترقی میں موجودہ تہذیب و تمدن کے فاسق و فاجر کھلاڑیوں سے مسابقت کا خیال چھوڑ دیں، پھر انشاء اللہ پاکستان و ہندوستان کی ہر مذہبی درس گاہ میں آپ کو نمونے مل جائیں گے۔

ہماری گھریلو زندگی کی بنیادی خصوصیات اسلام کی رو سے چار ہیں: ایک تحفظِ نسب جس کی خاطر زنا کو حرام اور جرم قابلِ تعزیر قرار دیا گیا ہے، پردے کے حدود قائم کیے گئے ہیں اور زن و مرد کے تعلق کو صرف جائز قانونی صورتوں تک محدود کر دیا گیا ہے جن سے تجاوز کا اسلام کسی حال میں بھی روادار نہیں ہے۔ دوسرے تحفظِ نظامِ عائلیہ جس کے لیے مرد کو گھر کا قوام بنایا گیا ہے، بیوی اور اولاد کو اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اولاد پر خدا کے بعد والدین کا حق سب سے زیادہ رکھا گیا ہے۔ تیسرے محبت و معاشرت جس کی خاطر زن و مرد کے حقوق معین کر دیئے گئے ہیں، مرد کو طلاق کے اور عورت کو خلع کے اور عدالتوں کو تفریق کے اختیارات دیئے گئے ہیں، اور الگ بچنے والے مرد و عورت کے نکاحِ ثانی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے تاکہ زوجین یا تو حسن سلوک کے ساتھ رہیں، یا اگر باہم نہ نباہ سکتے ہوں تو بغیر کسی خرابی کے الگ ہو کر دوسرا بہتر خاندان بنا سکیں۔ چوتھے صلہ رحمی جس سے مقصود رشتہ داروں کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار بنانا ہے اور اس غرض کے

یہ ہر انسان پر اجنبیوں کی بہ نسبت اس کے نشتہ داروں کے حقوق مقدم رکھے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس بہترین نظامِ عالمہ کی قدر نہ پہچانی اور اس کی خصوصیات سے بہت کچھ دُور ہٹ گئے ہیں۔ اس نظامِ عالمہ کے اصولوں میں شہری اور دیہاتی کے لیے کوئی فرق نہیں ہے، رہے طرزِ زندگی کے مظاہر تو وہ ظاہر ہے کہ شہروں میں بھی کیساں نہیں ہو سکتے، کجا کہ شہریوں اور دیہاتیوں کے درمیان کوئی یکسانیت ہو سکے۔ فطری اسباب سے ان میں جو فرق بھی ہو وہ اسلام کے خلاف نہیں ہے بشرطیکہ بنیادی اصولوں میں رد و بدل نہ ہو۔

چھوٹے ہوتے فرائضِ شرعیہ کی قضا کا مسئلہ

سوال۔ گذشتہ ترجمان القرآن کے رسائل و مسائل میں ایک سوال کے جواب میں چھوٹی ہوتی نمازوں اور دیگر فرائضِ شرعیہ کی قضا کے بارے میں آپ نے لکھا ہے: ان کی قضا کا آسان طریقہ یہ ہے کہ فرض نمازوں کے بعد جو سنتیں عموماً پڑھی جاتی ہیں انہیں چھوٹے ہوئے فرضوں کی قضا کی نیت کر کے پڑھا جائے تو اس طرح آسانی سے آدمی اس فرض سے مکمل و ش ہو سکتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فی الواقعہ اس طرح سے چھوٹے ہوئے فرائض کی قضا لازماً ہر اس شخص کو دینی ٹپے کی جس نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ جاہلیت کی حالت میں گزارا ہے؟ ظاہر ہے کہ مسائل کا انشاؤں فرائضِ شرعیہ کی قضا کے متعلق تو وہ یافت کرنا نہیں ہے جو کسی عذرِ شرعی کی بنا پر آدمی سے چھوٹ جاتے ہیں بلکہ ان فرائض سے ہے جن سے وہ دیدہ دانستہ اور محض بے عملی کی وجہ سے ایک مدت (پانچ، دس، بیس تیس سال) تک غفلت اور بے پروائی برتا رہا ہے۔ اب اگر وہ پورے غم و استقلال کے ساتھ اپنی سابقہ زندگی سے تائب ہو کر آئندہ اپنی زندگی کو شریعت کے مطابق بسر کرنے کا عہد کر لے تو وہ فرائضِ شرعیہ کی پوری پوری پابندی کر لے تو کیا سابقہ زندگی کے متروکہ فرائض کی قضا بھی اسے لازماً دینی ہوگی؟